

مکاتیب

(۱)

محترم مولانا زاہد الراشدی، زید مجدہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جیسا کہ اطلاع ہے، آپ ان دنوں آپ ہمارے پردیسی دیس میں ہیں۔ خوش آمدید۔ امید ہے مشافہۃ بھی پذیرائی کا موقع ملے گا۔ اس ماہ کا الشریعہ دو ہی دن ہوئے ملا ہے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ بات وفاق کے ایسے صاف و صریح تبصرہ تک پہنچ گئی۔ بظاہر اس سے پہلے کوئی ذاتی رابطہ بھی اس موضوع پر نہیں کیا گیا۔ بہر حال خدا کرے کہ ”ماذوق“ میں سے نیر نکلے۔ شمارہ کی سب سے پہلی چیز اس کا ”کلمہ حق“ تھی۔ آپ کے محترم غامدی صاحب جس تسلسل سے ایک مستقل موضوع الشریعہ کا چلے آتے ہیں، اس سے مجھ ایسے ایک قاری کو بھی جو کچھ زیادہ دلچسپی اس موضوع میں نہ لیتا ہو، ایک تاثر، کم از کم الشریعہ کی نگاہ میں، ان کے کچھ نہ کچھ ہونے کا بہر حال ملتا ہے۔ اس دفعہ کا آپ کا کلمہ حق بھی اسی موضوع کی نذر تھا اور وہ قدرتی طور پر اس تاثر کو اور گہرا کرنے والا۔ مگر اس میں سنت کے بارے میں موصوف کے اپنے تصور اور اس کی بنا پر سلف کے تصور سنت کا تنقیدی تجزیہ دیکھ کر سوچنے لگا کہ کیا یہ واقعی آپ کی اس قدر سنجیدہ توجہ کا مستحق تھا جس قدر سنجیدگی سے آپ نے کچھ جو ابی معروضات آں موصوف کی خدمت میں پیش کی ہیں؟ مگر اس سے کچھ زیادہ دخل در معقولات کا ارادہ میں نہیں رکھتا تھا کہ آگے ورق گردانی میں ”غامدی صاحب کے تصور سنت پر اعتراضات کا جائزہ“ کے عنوان سے مضمون نظر پڑا تو قدرتی طور سے ایک اچھتی نگاہ اس پر بھی ڈالے بغیر نہ رہا جاسکا۔ اور یہاں تو سنت کے ساتھ موصوف کا وہ معاملہ دیکھا کہ بلا مبالغہ پر ویز صاحب کی یاد تازہ ہو گئی، جو قرآن وحدیث کی تفسیر و تشریح میں آزاد شاعری والا معاملہ رکھتے تھے کہ کسی ضابطہ و قاعدہ سے استناد کی اس میں انھیں ضرورت نہ تھی۔ وہ بجائے خود سند ہو گئے تھے، اور ماننے والے انھیں ملے۔

مذکورہ مضمون میں داڑھی سے متعلق حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مفہوم پر موصوف کا ایک اقتباس دوسرے ہی صفحہ پر ملتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک ”مشرکوں سے مختلف وضع اختیار کرو، داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں گھٹاؤ“ (خالقوا المشرکین اوفروا اللحیٰ واعفوا الشوارب) سے آپ کا مدعا و مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”(لوگ) بڑھانا اگر چاہتے ہیں تو داڑھی بڑھالیں مگر مونچھیں ہر حال میں پست کریں۔“ یعنی داڑھی بڑھانے کا حکم نہیں، صرف اباحت و اجازت تھی، جبکہ مونچھوں کی تراش کے بارے میں حکم تھا۔ کہنا چاہیے کہ یہ بیان اباحت بھی خاص طور پر گویا ان کے لیے تھا جو مونچھیں کچھ نہ کچھ بڑھانے کے شوقین ہی ہوں، کہ اس کا ایک بدل ان کے شوق کی ایک گونہ تسکین کو مل جائے۔ پورا اقتباس آپ خود دیکھ لیں، جس میں ارشاد کے اس مبینہ مفہوم کے ماتحت اس کی حکمت بھی بیان

ہوئی ہے۔ میں بڑا حیران ہوں کہ کیا حدیث کے ساتھ اس طرح پیش آنے والوں کو بھی وہ اہمیت آپ جیسے اہل علم اور شیعنی خادمان حدیث کے یہاں دی جاسکتی ہے جو الشریعہ کے تقریباً ہر شمارہ سے نمایاں رہتی ہے! کم از کم مجھے تو نہیں معلوم کہ زبان کا کون سا قاعدہ الفاظ حدیث کا یہ ”شتر گر بانہ“ مطلب بھی لے لینے کی اجازت دیتا ہے۔ میں یقیناً بہت کم علم ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا کوئی قاعدہ آپ کے علم میں بھی نہ ہوگا۔ البتہ اپنے اس گمان میں مجھے شبہ اس لیے کرنا چاہیے کہ الشریعہ نے اس بیان مدعا پر کوئی تردیدی یا اختلافی نوٹ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی ہے۔

ضمناً ایک اور گزارش بھی۔ فروری کا الشریعہ میں نے لکھنؤ میں پڑھا تھا۔ واپسی ابھی دو ہفتہ قبل ہوئی ہے۔ اس میں بھی ایک چیز چند سطروں کی طالب تھی۔ ”مقام عبرت“ کے عنوان سے ایک مضمون تھا جس میں سورہ نساء کی آیت ۱۵ (والتسی یأتین الفاحشۃ من نساءکم) کی تاویل کے بارے میں صاحب مضمون نے غامدی صاحب کے بارے میں عزیز گرامی حافظ عمار خاں صاحب کے حوالہ سے نقل کیا تھا کہ ”جناب جاوید احمد غامدی نے مولانا اصلاحی کی رائے کے اس پہلو سے توافق کیا ہے کہ یہ آیت زنا کے ان مجرموں سے متعلق نہیں جو کسی وقتی جذبات کے غلبہ میں زنا کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں بلکہ دراصل زنا کو ایک عادت اور معمول کے طور پر اختیار کرنے والے مجرموں سے متعلق ہے۔“ میں قرآن پاک کو سمجھنے کی کوشش میں مولانا اصلاحی کی کتاب سے بھی استفادہ کرنے والوں میں ہوں۔ کچھ ہی پہلے اپنے سلسلہ مخفل قرآن میں اس آیت سے گزرتے ہوئے مولانا کی تدریس قرآن بھی دیکھی تھی اور ان کی جو رائے تھی، وہ بہت بہتر معلوم ہوئی تھی۔ اور وہ کسی بھی طرح یہ نہیں تھی جس کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہے، جس سے عہد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلم معاشرہ کے بارے میں ایک کرہ تصور کو راہ ملتی ہے۔ میرے پاس انجمن خدام القرآن کا ۱۳۹۶ھ کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس میں ”ایک عادت اور معمول کے طور پر“ والی بات کا شائبہ بھی ہو۔ میں مولانا کا حق سمجھتا تھا کہ ان کی براءت میں یہ سطر آپ کو لکھ دوں۔

(مولانا) عتیق الرحمن سنہلی

(۲)

برادر مکرم مولانا عمار خان ناصر مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

یکے بعد دیگرے آپ کے ارسال کردہ کئی ”علمی تحائف“ موصول ہوئے۔ ان نوازشات پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ کا ارسال کردہ تازہ کتابچہ جو آپ نے مولانا مفتی عبدالواحد کی تقیدات کے جواب میں لکھا ہے، اس سے بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ بعض اسلاف کے تفردات کی آڑ میں آپ اجماع سے انکار کر رہے ہیں۔ اجماع کی آپ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

محترم! آپ فرماتے ہیں کہ سلف صالحین کی کتابوں سے ہٹ کر کوئی رائے قائم کرنا درست ہے۔ اس پر آپ نے کئی مثالیں تحریر کیں جو کہ تفردات کے ضمن میں آتی ہیں۔ احقر نے الشریعہ اکیڈمی میں بھی اپنے ایک مختصر بیان میں حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب مدظلہ سے سوال پوچھا تھا کہ تفردات اور فکری گمراہی میں حد فاصل کیا ہے؟ لیکن حضرت نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ سے بھی اسی سوال کا جواب مطلوب ہے۔ کیا آپ وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟

_____ ماہنامہ الشریعہ (۱۵۶) مئی/جون ۲۰۰۹ _____

مخدوم گرامی! آپ نے آزادی اور لا اکراہ کا جو نعرہ بلند کیا ہے، اس کے بعد آپ غلط عقائد و افکار و اعمال رکھنے والوں کو کیسے روک سکیں گے؟ وہ بھی تو یہی کہیں گے کہ اسلاف کی راے کے خلاف راے قائم کرنا جائز ہے، اس لیے ہم کسی تنقید کو نہیں مانتے۔ ماہو جو ابکم فہو جو ابنا۔

محترم! میں بعض معاصرین کی طرح بازاری لہجہ میں گفتگو کا قائل نہیں ہوں، لیکن آپ کو برادرانہ طور پر تنہائی میں بارہا سمجھا چکا ہوں۔ آپ لا جواب ہو جاتے ہیں، مانتے نہیں ہیں۔ احقر کو آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ اپنی علمی جدوجہد اس انداز میں کیوں نہیں کرتے کہ عوام و خواص سب کو فائدہ ہو۔ الٹا آپ نے حضرت راشدہ صاحب کو بھی صحیح بخاری کے ترجمہ و مختصر حواشی کے کام سے روک دیا۔ ان اللہ وانا الیہ راجعون۔ اگر دارالسلام والے صحیح بخاری پر کام کر رہے ہیں تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اب قیامت تک کسی اور کو اس پر کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے، سب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں؟ نئی آرا و افکار آپ جیسی باریک بینی سے تلاش کرتے ہیں، وہ قابل داد ہے۔ علم و ذہانت آپ کا خاندانی ورثہ ہے۔ لیکن ناراضگی، معاف، آپ اس خداوند نعمت کو صحیح استعمال نہیں کر رہے۔ آپ غامدی صاحب کے پسندیدہ موضوعات کو ہی زیر بحث لاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے، آپ بہتر جانتے ہیں۔

کتنا پچھتے آؤں! آخری صفحہ پر آپ نے اہم بات لکھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ علمی تفردات امت محمدیہ نے کبھی قبول نہیں کیے۔ الحمد للہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ’لا تجتمع امتی علی الضلالة‘ (او کما قال علیہ السلام) کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لیکن آپ نے اپنا سارا وزن تفردات کے پلڑے میں کیوں ڈال رکھا ہے، جب کہ ان کے قبول عام نہ ہونے کا آپ کو اعتراف بھی ہے؟ بالفاظ دیگر آپ کی سعی عملاً حاصل ہے، تاہم حسن نیت کا ثواب تو آپ کو مل ہی جائے گا۔ کیا آپ ایک بے فائدہ و بے نتیجہ کام پر نظر ثانی کرنا اور اسے چھوڑنا پسند فرمائیں گے؟ ان گزشتات کی تلخی پر معذرت خواہ ہوں۔

(مولانا) مشتاق احمد

استاد جامعہ عربیہ چنیوٹ

(۳)

برادر مکرم مولانا مشتاق احمد صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ نے اپنے عنایت نامے میں، تلخی کے ساتھ ہی سہی، جس ہمدردی، محبت اور خیر خواہی کا اظہار فرمایا ہے، اس کے لیے شکر گزار ہوں، البتہ شکوہ یہ ہے کہ آپ میری آرا کا جائزہ میرے زاویہ نگاہ سے لے کر ان کی غلطی واضح کرنے کے بجائے ہمیشہ اپنے ذہنی تحفظات اور تعصبات کے تحت ہی ان پر غور فرماتے اور میری بات سمجھنے کے بجائے ہمیشہ اپنی بات ”سمجھانے“ کی کوشش کرتے ہیں۔ ممکن ہے، آپ اور آپ جیسے دوسرے مخلص دوستوں کے نزدیک خلوص کا تقاضا یہی ہو، لیکن کسی علمی اور فکری بحث میں اگر آپ مخاطب کے سوالات کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہ کریں تو اس کے ساتھ کی جانے والی ساری گفتگو درحقیقت خودکلامی بن جاتی ہے اور بحث کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ ”ہم اس کے قائل نہیں کہ بے فائدہ

بجٹوں میں الجھیں۔“

بہر حال آپ نے جو چند نکات اٹھائے ہیں، ان سے متعلق مختصراً اپنی معروضات پیش کر رہا ہوں۔
آپ نے فرمایا ہے کہ ”تفردات اور فکری گمراہی میں حد فاصل کیا ہے؟“ میرا سوال یہ ہے کہ اگر ایسی کوئی حد فاصل موجود نہیں تو ”علمی تفرّد“ اور ”فکری گمراہی“ کی الگ الگ اصطلاحات وضع کرنے اور ان کو الگ الگ مواقع پر استعمال کرنے کا تکلف ہی کیوں کیا گیا ہے؟ یہ فرق ایسا واضح ہے کہ مثال کے طور پر میں نے اکابر اہل علم کی جو منفرّد آرائشیں کی ہیں، آپ بھی انہیں ”فکری گمراہی“ قرار نہیں دیں گے اور نہ کبھی انہیں اس طرح تنقید کا موضوع بنائیں گے جس طرح آپ بہت سی ”فکری گمراہیوں“ کو بناتے ہیں۔ اگر آپ کا ذہن عام راے سے علمی اختلاف اور فکری گمراہی میں فرق کرنے سے اتنا ہی قاصر ہے تو آپ اپنے اس طرز عمل کی کیا توجیہ کریں گے؟

آپ فرماتے ہیں کہ آزادی فکر کا نعرہ بلند کرنے کے بعد ”آپ غلط عقائد و افکار و اعمال رکھنے والوں کو کیسے روک سکیں گے؟“ یہ سوال اس مفروضے پر مبنی ہے کہ کسی فکری یا عملی گمراہی کی غلطی واضح کرنے کا حتمی اور فیصلہ کن معیار یہ ہے کہ آپ اس کا سلف کے نقطہ نظر کے خلاف ہونا ثابت کر دیں۔ میرے نزدیک یہ طریقہ عوام کی سطح پر تو مفید ہو سکتا ہے، لیکن علمی لحاظ سے ایک بے حد کمزور طریقہ ہے۔ علمی سطح پر کسی نقطہ نظر کی غلطی یا گمراہی کو واضح کرنے کے لیے براہ راست اس استدلال کو موضوع بنانا ہوگا جو قرآن و سنت کے نصوص کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے، اور اگر اہل علم نے ہمیشہ یہی کیا ہے۔ پھر یہ کہ اگر آپ کے مفروضے کے مطابق، ہم سرے سے آزادی فکر کے حق سے ہی دست بردار ہو جائیں، خواہ وہ محکم اور مسلمہ علمی اصولوں ہی کے دائرے میں کیوں نہ ہو، تو اس سے غلط عقائد و افکار و اعمال کا سدباب کیسے ہو جائے گا؟ جس شخص یا گروہ نے کوئی گمراہی کی راہ اختیار کرنی ہے، کیا وہ ایسا کرنے سے پہلے میرے اور آپ کے ”اسوۂ حسنہ“ کو دیکھے گا اور ہمیں سلف سے اختلاف نہ کرتا دیکھ کر خود بھی کوئی نئی راہ نکالنے سے باز آ جائے گا؟ برانہ ما نہیں تو آپ کا یہ ذہنی تحفظ مذہبی ذہن کی سادگی بلکہ سادہ لوحی کی غمازی کرتا ہے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب امت نے کبھی اہل علم کے تفردات کو قبول نہیں کیا تو ان کی وکالت یا ترجمانی سعی لا حاصل کا درجہ رکھتی ہے۔ غالباً آپ کو رازی، شاہ ولی اللہ، ابن تیمیہ، علامہ انور شاہ، مولانا نانوتوی اور مولانا تھانوی رحمہم اللہ سے مخاطب ہونے کا موقع ملتا تو آپ انہیں بھی یہی ”نصیحت“ فرماتے۔ ازراہ کرم آپ ہی بتائیں کہ اس طرز فکر کو کس حد تک ”علمی رویے“ کا نام دیا جاسکتا ہے؟ کیا کسی صاحب علم کے اپنی راے پیش کرنے یا کسی راے کی تائید کرنے کا مقصد اور محرک یہ ہوتا ہے یا ہونا چاہیے کہ اسے لوگوں میں قبول عام حاصل ہو جائے؟ معاف کیجیے، یہ ذہنیت پیری مریدی کے حلقوں اور فرقہ وارانہ تعصبات رکھنے والے گروہوں کی تو ہو سکتی ہے، لیکن خالص علمی سطح پر قرآن و سنت پر غور کرنے والے اہل علم نے کبھی اس کی آرزو کی ہے اور نہ کوشش۔ آپ کے نزدیک اگر کسی سعی کے با حاصل یا لا حاصل ہونے کا معیار یہی ہے تو مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے بارے میں علم و تحقیق سے شغف رکھنے کا جو حسن ظن رکھتا ہوں، شاید مجھے اس پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔

محمد عمار خان ناصر

(۴)

فضیلۃ الشیخ محترم مولانا زاہد الراشدی

_____ ماہنامہ الشریعہ (۱۵۸) مئی/جون ۲۰۰۹ _____

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہنامہ الشریعہ کے حالیہ شمارے کو انٹرنیٹ پر دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں ماہنامہ وفاق المدارس کی طرف سے عمار خان ناصر صاحب کی کتاب ”حدود و تعزیرات“ کے حوالے سے ان کی تنقید اور تبصرہ پڑھنے کا موقع ملا۔ ساتھ ہی آپ کی طرف سے اس عزم کا اظہار بھی کہ آئندہ شمارے میں ان اعتراضات کا مفصل جواب دیا جائے گا۔

استاذ محترم! میں اپنے بچپن سے یہ باتیں سنتا پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ کہیں دارالعلوم دیوبند کے یہ فرزند ان جو کبھی علم کی شمع فروزاں کیے رکھتے تھے، اب وہ حیاتی اور مماتی کے لا حاصل مناظروں میں اپنی صلاحیتیں کھپاتے دکھائی دیتے تو کبھی سیاسی محاذ پر مولانا عبداللہ درخواستی گروپ، مولانا فضل الرحمن گروپ اور مولانا سمیع الحق گروپ میں منتقم دکھائی دیے۔ کہیں یہ فرزند ان اسلام اپنے معمولی اختلافات کو مناظرانہ رنگ دے کر اخبارات تک میں ایک دوسرے کے اعتراضات کے جواب اور پھر جواب الجواب میں مصروف رہتے۔ دیوبند کے یہ علماء جہاں بریلویوں اور اہل تشیع کے باطل افکار کی تردید کر رہے ہوتے تھے، وہاں یہ آپس میں بھی دست بگریباں نظر آتے تھے۔ ہم تو اس وقت آپ حضرات کا نام سن کر ادب سے ہی دبک جایا کرتے تھے۔ پھر ہم نے تو ہلے کر لیا کہ اپنے اکابرین اور اساتذہ کو ہر حال میں احترام سے یاد رکھیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اب معاملہ یہاں تک آ بیچنا ہے کہ وفاق المدارس، جو دیوبندیوں کا نمائندہ مجلہ اور دیوبندیوں کے مدارس عربیہ کا امتحانی بورڈ ہے، وہ آپ کے بیٹے کی کتاب ”حدود و تعزیرات“ کے حوالے سے نہایت برہم دکھائی دیتا ہے۔ ان کے انداز بیان میں خشکی کی جگہ دشتی، شائستگی کی جگہ مناظرانہ جدلیت، قرینے کی جگہ بدسلوکی نمایاں طور پر دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔ اختلاف راے کے مختلف مراحل میں دلیل و برہان کی بے وقعتی تو ہم اپنے بڑوں کے طرز عمل میں اپنے بچپن ہی سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں جس کی وجہ سے گفتگو علمی اور تحقیقی معیارات سے ہٹ کر قطعیت کے ساتھ عدم توازن کا شکار ہو جاتی ہے۔

جو چیزیں ماہنامہ وفاق المدارس میں ”حدود و تعزیرات“ کے حوالے سے پیش کی گئی ہیں، انہیں پڑھ کر میرا ایک طرفہ تاثر، ممکن ہے اس کتاب کے خلاف قائم ہوا ہو، اس لیے اس کتاب کے حصول کے لیے میں نے فوری طور پر رابطہ قائم کیا ہے۔ لیکن میری اختلافی راے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں توازن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر مناظرانہ کیفیت کا شکار ہو جاؤں، میری سانسیں پھول جائیں، گردن کی رگیں تن جائیں، آنکھیں شعلہ بار ہو جائیں اور منہ میں جھاگ آ جائے۔ ہرگز نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں اس کتاب کو پڑھوں گا۔ اگر اس میں پیش کردہ بیانات اور مواد قرآن و سنت کے خلاف ہوئے تو ایک اختلافی نوٹ کے ساتھ مصنف کی توجہ اس کی علمی اور تحقیقی بے قاعدگیوں کی طرف ضرور مبذول کراؤں گا اور سمجھوں گا کہ جیسے اس عقلیت پرستی کے دور میں اور بہت ساری دیگر کتب موجود ہیں، یہ اسی ذخیرہ کتب میں ایک اور اضافہ ہے۔

آپ سے مودبانہ گزارش ہے کہ آپ نے ”الشریعہ“ کے آئندہ شمارے میں ماہنامہ وفاق المدارس کے جن اعتراضات کے حوالے سے جواب دینے کا ارادہ فرمایا ہے، اسے منسوخ فرمادیجیے۔ ہم ماہنامہ وفاق المدارس کی مجلس ادارت سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ بھی آپس میں علمی اختلاف راے کو اپنی مناظرانہ طبیعت کی بھینٹ چڑھنے سے بچائیں۔

محمد طارق نورانی

(فاضل دارالعلوم فیصل آباد)

پی ایچ ڈی اسکالر پشاور یونیورسٹی

(۵)

محترم مدیر الشریعہ
السلام علیکم

آج اسلام کی جو تصویر دنیا کو نظر آ رہی ہے، اس میں وحشت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسلام خود کش حملہ آوروں کا مذہب بن گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ دہشت گردوں کا مذہب ہے، جب کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم نے تشدد کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور پر امن وادیوں کو بارود سے بھر دیا ہے۔ میں سزا اور جہاد سے انکار نہیں کرتا۔ دنیا کی دیگر قومیں بھی مذہب کے نام پر جنگ لڑتی رہی ہیں اور ان کے مذہبی قوانین میں بھی سخت سزائیں موجود ہیں، ہر چند کہ اب ان کی حکومتیں مذہب کے زیر اثر نہیں ہیں۔ انہوں نے مذہب کو عبادت گاہوں تک محدود کر دیا تھا اور زندہ رہنے کے لیے الگ سے قوانین بنا لیے ہیں۔

لیکن میں یہاں مختلف بات کہنا چاہتا ہوں۔ اسلام پہلے فلاحی ریاست کا تصور دیتا ہے، فرد کو تحفظ فراہم کرتا ہے اور ان کے روزگار کا انتظام اپنے ذمہ لیتا ہے۔ مسلمان حاکم اس بات سے ڈرتا ہے کہ اس کی ریاست میں کوئی شخص بھوکا نہ رہ جائے۔ یہ دراصل خوف خدا ہے جسے ہر حاکم کے دل میں ہونا چاہیے۔ سزا دینے سے پہلے اس بات کا اطمینان کیا جاتا ہے کہ یہ شخص گنہگار ہے یا نہیں، لیکن ہم نے تو آغاز ہی سزاؤں سے کیا ہے اور وہ بھی یوں کہ ایک عورت کو مردوں کے جہوم میں کوڑے مار کر نفاذ اسلام کا اعلان کیا ہے۔ یہاں اصلی یا جعلی کی بحث کیا کرے گی۔ دنیا بھر میں جو تاشا قائم ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ اگر انارکی نے اسی انداز میں فروغ پایا تو پھر بہت سی خود ساختہ عدالتیں قائم ہو جائیں گی اور ہر گلی محلے میں انصاف ہونے لگے گا۔ ہر جگہ کوڑے مارے جائیں گے اور پھانسی گھاٹ ہر چوراہے پر نظر آئیں گے۔

جہاد کی اب مختلف صورت سامنے آئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر شخص نے اعلان جنگ کر دیا ہے۔ انفرادی جہاد نے خود کش حملہ آور پیدا کر دیے ہیں۔ یہ جہادی مساجد اور دیگر عبادت گاہوں کا رخ کرتے ہیں۔ ہر روز لوگ مر رہے ہیں اور یہ زمین بے گناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی ہے۔ یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا، کوئی نہیں جانتا۔ ہمارا کام تو صرف اتنا ہے کہ ہم ہر روز کسی نئے دھماکے کی آواز سنیں اور ایک دن خود کسی دھماکے کی نذر نہ ہو جائیں۔

جاوید اختر بھٹی

(۶)

برادر م جناب عمار خان ناصر صاحب

السلام علیکم۔ امید ہے مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔

اپریل کی اشاعت میں ”مکاتیب“ میں قرآن الکیڈمی کے ایک ریسرچ ایسوسی ایٹ کا مکتوب شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اپنی اعلیٰ درجے کی کم ظرفی کا نہایت پس انداز میں اظہار کیا ہے۔ میں نے جب کتاب ”چہرے کا پردہ“ پر تبصرہ آپ کو ارسال کیا تھا تو مصنفین کا نام نہیں لکھا تھا، بلکہ تبصرے میں یہ تک لکھا کہ ”محمد احسن تہامی نے اس تمام علمی بحث کی ۱۷ اقساط کو ایک منظم ترتیب سے بے کم و کاست کتابی شکل میں محفوظ کر کے ارباب بصیرت کے حضور ایک فکری کاوش کے روپ میں پیش کر دیا ہے۔“ (الشریعہ، مارچ ۲۰۰۹ء، ص ۵۶) غالباً ادارے کی جانب سے کتاب کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے مصنفین کے طور پر پروفیسر خورشید عالم کے ساتھ حافظ محمد زبیر کا نام بھی درج کیا گیا ہے جسے مکتوب نگار

نے ”بدیانتی“ کا عنوان دیا ہے۔ شاید انھیں بددیانتی کے معنی کی خبر نہیں ہے۔ وہ تو شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ غیر قانونی، غیر اخلاقی اور غیر شرعی حرکات جیسے الفاظ کسی کتاب میں ان کے مضامین شائع کرنے پر کہے جاسکتے ہیں یا نہیں۔ کوئی مصنف جب جو کچھ اپنی کج فہم فکر میں آئے، اسے قلم بند کر دینے کے بعد بچھڑتا ہے تو اپنی تحریروں کو کتابی صورت دینے والے کو غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکت کے طعنے کی بجائے اسے اپنی عقل کا ماتم کرنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مصنف کا یہ مکتوب میرے اس پیرا گراف کا رد عمل ہے کہ ”حافظ محمد زبیر کے علمی مرتبے اور تحقیق کے اسلوب کے حوالے سے جو تاثر اس کتاب کے مطالعے سے قائم ہوتا ہے، اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ انھیں تحقیق کے میدان میں ابھی خاصا سیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ غلط بحث سے کام لیتے ہوئے کس طرح غیر متعلقہ معاملات اٹھاتے ہوئے علمی دیانت کے منافی طرز اختیار کرتے ہیں۔ ان کی عربی دانی کی قابلیت جس طرح ان کے نادر نمونوں سے سامنے آتی ہے، اس کو کوئی اور مثال ابھی تک ہمارے سامنے نہیں ہے کہ وہ کس طرح جا بجا الفاظ کے غلط معنی اور کئی مقامات پر احادیث کے غلط ترجمے کر کے ایک افسوس ناک اور غلط روایت کے امین ہونے کا بھرپور ثبوت دے رہے ہیں۔ حکمت قرآن مارچ ۲۰۰۶ء میں اشاعت پذیر ان کے مقالے میں اٹھارویں حدیث کا ترجمہ انہوں نے جس طرح سے کیا ہے، اس پر افسوس کا اظہار ہی کیا جاسکتا ہے کہ اصل معاملہ کیا تھا اور حافظ محمد زبیر نے کیا سے کیا کر کے پیش کیا ہے۔ (ص ۱۹۰) اسی طرح نہ الفاظ کی دلالت سے نہ معانی کی دلالت سے، نہ ہی لغت کی شہادت سے ’جلباب‘ کا معنی وہ نکلتا ہے جو حافظ محمد زبیر نکالتے ہیں۔ (ص ۲۲۲) فضیل بن عباس والی روایت کا مکمل علمی تجزیہ (ص ۲۲۷) پڑھ کر ہمیں حافظ محمد زبیر کی علمی استعداد اور طرز استدلال سے جو آگاہی ہوتی ہے، اس پر فائز و ابوالی الا بصاری کہا جاسکتا ہے۔ غلط ترجمہ، بودے استدلال، معانی میں تحریف، اور غیر متعلقہ معاملات اٹھانے کی روایت کے ساتھ ساتھ عربی لغت سے ناواقفگی کے باعث اگر حافظ محمد زبیر، پروفیسر خورشید عالم کی طرف سے دیے گئے مشوروں کو قبول کر لیں اور آئندہ بحثوں میں زیادہ سنجیدگی اور محنت سے کام لیں تو اس مباحثے کا حق ادا ہو جائے گا۔“ (ص ۵۶)

مجھے ایک مبصر کی حیثیت سے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے محاسن و معائب کو بیان کرنے اور اپنے تاثرات کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کا پورا حق حاصل تھا۔ اگر مصنف اپنے لکھے ہوئے مضامین سے منصرف ہو چکے ہیں تو اس میں تبصرہ نگار کا کیا قصور؟ انھیں چاہیے تھا کہ جن نکات کی طرف میں نے بطور مبصر توجہ دلائی ہے، اگر وہ درست نہیں تھے تو اپنے خط میں ان کے بارے میں اپنا زاویہ نظر پیش کرتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ مذکورہ نکات کا آنے والے دنوں میں بھی اگر کوئی سائل ان سے جواب مانگے گا تو وہ اپنے قلم کی کتب سے کف اڑانے کے سوا کیا کہیں گے۔ اس کے سوا ان کی علمی ذمیل میں ہے ہی کیا؟

مکتوب نگار کو شکایت ہے کہ ”دارالتدکیر کے مالکان میرے نام سے میری اجازت کے بغیر ایک ایسا موقف پیش کر رہے ہیں جو کہ اب میرا نہیں ہے۔“ بہر حال اب جبکہ وہ اپنا نظر ثانی شدہ موقف اپنے زیر اہتمام شائع کر رہے ہیں، انھیں پوری احتیاط اور محنت سے کام لینا چاہیے، کیونکہ اس کے بعد وہ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ”قرآن اکیڈمی کے مالکان میرے نام سے ایک ایسا موقف پیش کر رہے ہیں جو کہ میرا نہیں ہے۔“ جس کسی کو اس حوالے سے میرا موقف جاننا ہو، وہ میری کتاب کی اشاعت کا انتظار کرے۔“

ڈاکٹر انوار احمد اعجاز